Tarjihaat
Volume:IV
Issue: III
مارچ ۲۰۲۴
March. 2024
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
Online Research Jornal

محسن خالد محسنؔ لیکچرار (گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج، لاہور)
mohsinkhalid53@gmial.com /+92-301-4463640
عظمیٰ نورین لیکچرار (گورنمنٹ وومن یونیورسٹی، سیالکوٹ)
uzmanoreengcwus@gmail.com
امامہ ریاست پی ایچ ڈی سکالر اُردو (نادردن یونی ورسٹی نوشہرہ، خیبر پختون خوا)
Imamariasat2020@gmail.com

جمیلہ ہاشمی کا معاشرتی شعور ''دشتِ سوس'' کے تناظر میں

Jamila Hashmi's social consciousness in the context of "Dasht-e-Sous"

ABSTRACT

In the latter half of the 20th century, when the novel Dasht Soos came out, there was a stir in Urdu literature. This novel has been seen, tested, evaluated, and felt from many angles. Many levels of this novel have been revealed, and this novel has been given a place as a representative novel of the twentieth century in the genre of novel writing. This paper is based on the analysis of collective thinking that promotes dynamic mystical values in the novel in the background of the social decline of Dasht Sus, from which the double meaning of the novel in social, cultural, and eastern society and the ugly face of the decline of pluralistic ideas. It will open up. This thesis will play an important role in viewing and formulating opinions on the character, dialogue, incident, and detail aspects of Dasht Soos novel in the context of the turbulent period of the twentieth century.

Keywords: *Twentieth century, Mansoor Hallaj, Sufism, Eastern society, Islamic religion, politics, social problems, Abbasid caliphate, sectarianism, Fana fi Allah, Islam*

خلاصہ: بیسوی صدی کے نصف اواخر میں ایک ناول دشت سوس سامنے آیا تو اردو ادب میں ہلچل مچ گئی۔ اس ناول کو کئی زاویوں سے دیکھا، پرکھا، آنکا اور ٹٹولا گیا، اس ناول کی کئی ایک سطحیں کھل کر سامنے آئیں اور اس ناول کو ناول نگاری کی صنف میں بیسویں صدی کے نمائندہ ناول میں جگہ دی گئی۔ یہ مقالہ دشت سوس کے معاشرتی تنزل کے پس منظر میں ناول میں متحرک متصوفانہ اقدار کو فروغ دینے والی اجتماعی سوچ کے تجزیے پر مبنی ہے جس سے ناول کی معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور مشرقی سماج میں دوہری معنویت اور تکثیری افکار کی تنزلی کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آئے گا۔ یہ مقالہ دشت سوس ناول کی کرداری، مکالماتی، واقعاتی اور جزیاتی پہلوؤں کو بیسویں صدی کے ہنگامہ خیز دور کے تناظر میں دیکھنے اور رائے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

کلیدی الفاظ: بیسویں صدی، منصور حلاج، تصوف، مشرقی سماج، دینِ اسلام، سیاست، معاشرتی مسائل، عباسی خلافت، فرقہ واریت، فنافی اللہ، اسلام

ہمارے ملک میں خواتین ناول نگار بھی ایک اہم مقام رکھتی ہیں جن میں ایک بڑا نام جمیلہ ہاشمی کا بھی ہے۔ مصنفہ نے اپنے ناولوں میں بہت سے اہم معاشرتی مسائل کی نشاندہی کی لیکن ناول دہشت سُوس لکھ کر انھوں نے واقعتاً ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی ناول ہے لیکن مصنفہ نے اس میں ایسے حساس معاشرتی رویوں اور نزاعات کو عیاں کیا ہے جس پر ہر قلمکار اپنے قلم کو اٹھا نہیں سکتا۔ اس ناول میں صرف تاریخی حقائق ہی نہیں ہیں بلکہ مذہب و عشق کے معاملات کے اندر چھپے نازک معاشرتی مسائل کو بھی چھیڑا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایسے مولویوں، مفتیوں اور مصنفین کے چہروں سے پردہ بھی اٹھایا گیا جو معاشرے میں اپنے غلط فیصلوں کی وجہ سے انتشار، ابتری اور ظلم و بربریت پھیلاتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی 17 نومبر 1929ء کو لائل پور جو کہ فیصل آباد کا پرانا نام ہے میں پیدا ہوئیں جب کہ ان کا آبائی وطن امرتسر ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے 1954ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور اسکول میں بطور معلم درس وتدریس کے فرائض سرانجام دینے لگیں۔ ان کے گھریلو ماحول میں نہ تو افسانوی فضا تھی اور نہ ہی ادب کی چاشنی بلکہ انھوں نے ایک ایسے عام ماحول میں پرورش پائی جہاں معمولی غلطیوں پر خوب پٹائی کی جاتی تھی لیکن جمیلہ ہاشمی کی فطرت میں ادب سے لگاؤ بچپن سے ہی موجود تھا جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ سکول میں پڑھتی تھیں تو انھیں اگر کسی عنوان پر مضمون لکھنے کو کہا جاتا تو وہ مضمون کے بجائے کہانی لکھنا شروع کی دیتی تھیں جس پر استانی سے بارہا ڈانٹ تو کھالی لیکن کہانی لکھنا ترک نہ کیا اور یوں ان کے اندر چھپی ہوئی لاتعداد کہانیوں نے آہستہ آہستہ پھلتے پھولتے ہوئے ایک تناآور درخت کی شکل اختیار کرلی۔

جمیلہ ہاشمی کی شادی ایک زمیندار خاندان میں ہوئی اور ان کے شوہر زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گدی نشین رہبر بھی تھے لیکن وہ اتنے روشن خیال، وسیع النظر اور بیوی سے محبت کرنے والے انسان تھے جنہوں نے اپنی بیوی کے لکھنے لکھانے کے شوق کی قدر کی اور کبھی انہیں اس کام سے نہ روکا۔ چنانچہ جمیلہ ہاشمی نے بھی بڑے شوق ولگن سے یہ تخلیقی سفر جاری رکھا اور اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے خاوند کے مرنے کے بعد جہاں زمینوں کے معاملات سنبھالے وہیں کاغذ و قلم سے رشتہ بخوبی نبھایا اور یہاں ان کی بیٹی جو کہ ان کی غمگسار ودوست تھی اس نے بھی انھیں حوصلہ دیا اور ان کی ہمت بندھائی۔ ابتداً مصنفہ روسی ادب سے بے حد متاثر تھیں بالخصوص چیخوف، ٹالسٹائی اور شولوخوف وغیرہ کی ان کی نگاہ میں بڑی قدر تھی جب کہ اردو ادب میں وہ خاص طور پر قرۃ العین حیدر پر جان چھڑکتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ایک آدھ افسانہ انھوں نے قرۃ العین حیدر کا طرز تحریر اپناتے ہوئے لکھا لیکن بعد ازاں گہرے مطالعے کی عادت نے ان کے طرز نگارش کو بدل دیا۔ ان کے ناولٹ میں "آتش رفتہ"، "روہی"، "آپ بیتی جگ بیتی" اور "اپنا اپنا جہنم" شامل ہیں جب کہ ان کے ناولوں میں "تلاش بہاراں 1961ء"، "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو 1977ء" اور "دشت سوس 1983ء" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ناول "تلاش بہاراں" پر تو انھیں "آدم جی" ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور اپنے اس پہلے ناول کے ساتھ ہی وہ بطور ناول نگار منظر عام پر آئیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زمانہ حاضر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو موضوع بحث بناتے ہوئے نئی نسل کے ذہنی وجذباتی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اردو ناول نگاری کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی نے "تلاش بہاراں" جیسا ناول لکھ کر جو مقام ومرتبہ حاصل کیا جس

میں اضافے کا باعث ان کا زیرِ تحقیق ناول "دشت سوس "بنا جو کہ ایک تاریخی ناول کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہے۔یہ ناول علمی وادبی حلقوں میں بہت زیادہ مقبول و معروف ہوا۔

یہ ناول نہ صرف بغداد کے درویش صوفی حسین بن منصور حلاج کی شخصیت کا تفصیلی مطالعہ کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اس دور کی معاشرتی، سیاسی اور مذہبی زندگی کا ترجمان بھی ہے۔اس میں کوئی دورائے نہیں پائی جاتی کہ تاریخی واقعات اور مذہبی عقائد پر قلم اٹھانا ایک مشکل امر ہے لیکن جمیلہ ہاشمی اس حوالے سے تاریخی واسلامی رجحان کی آبیاری کرنے والے ناول نگاروں میں ایک مسلم حیثیت رکھتی ہیں۔

دشت سوس ایک ایسا ناول ہے کہ جس کو اگر بار بار بھی پڑھا جائے تو انسان کا جی نہیں بھرتا گو کہ اس میں بعض جگہوں پر تاریخی حقائق کو چھپانے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود مصنفہ نے دسویں صدی کے عباسیہ خلافت کے دور کی تاریخ، جغرافیے، تصوف اور معاشرت کی ایک مکمل تصویر پیش کی ہے۔ناول "دشت سوس" 504صفحات پر مشتمل ہے اور ابواب کے حوالے سے اسے صدائے ساز، نغمہ شوق، اور زمزمہ موت جیسے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا۔ناول کا پہلا حصہ ابن منصور کے بچپن، اس کی ابتدائی تعلیم، تستر کی خانقاہ اور اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے حوالے سے تفصیلات فراہم کرتا ہے۔

ناول کا دوسرا حصہ جو کہ سب حصوں سے زیادہ طویل بھی ہے ابن منصور کی بغداد میں گزرنے والی زندگی اور اس کے روحانی سفر اور کشف و کرامات پر مبنی ہے جب کہ ناول کا آخری حصہ ابن منصور کے نعرہ "اناالحق" اور سزائے موت کے بیان پر مشتمل ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے ایک حساس اور نزاعاتی معاملہ کو موضوع بحث بنایا ہے یعنی ایک ایسا معاملہ کہ جس پر قلم اٹھانے کی جرات ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔اگر تاریخ اسلام و مسلمانان ہند کو غور سے پڑھا جائے تو بہت سے ایسے واقعات موجود ہیں کہ جن پر اگر قلم اٹھایا جاتا تو ان افکار و نظریات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم معاشرے کی بہتری کے لیے کام کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے قلم کاروں نے اس طرف سے ایسے چشم پوشی اختیار کی کہ جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔

دراصل ہمارے ہاں یہ سوچ پروان چڑھ چکی ہے کہ مذہبی اور نزاعاتی معاملات کو ضبط تحریر میں لانے سے مسلمانوں میں فتنہ فساد جنم لے گا اور یوں فرقہ وریت پروان چڑھے گی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی ادیب ایسے معاملات پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کا مقصد فساد برپا کرنا نہیں بلکہ تمام انسانیت کی بھلا ہی ہوتا ہے البتہ مسئلہ تو غور وفکر کا ہے۔بعض اوقات ایسے واقعات پر اس انداز میں تحقیق کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ اختلاف کا باعث بن گئے اور لوگ بدظن ہوئے اور یوں تاریخ کی اعلیٰ شخصیات کی سوچ اور نظریات سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انسان انسان کا دشمن بن گیا اور وہ تمام چیزیں یا صلاحیتیں جس سے مستفید ہوتے ہوئے اس دنیا کو جنت جیسا بنایا جا سکتا تھا اس کے بجائے یہ سب انسانوں کی بربادی کے لیے کارآمد ثابت ہوئیں۔

یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے خیالات اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہونے کے بجائے انھیں نظر انداز کر دینے ہی کی وجہ سے آج ہم مختلف فرقوں، ذاتوں اور معاشروں میں تقسیم ہو کر ذہنی الجھنوں اور عدم تحفظ کا شکار ہوئے بیٹھے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج

بھی تاریخ اسلام کی ایک ایسی ہی ہستی ہیں کہ جس نے اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کے اسرار و رموز پر گہرائی سے غور و فکر کرتے ہوئے اپنے عہد کے حوالے سے ایسے عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس وقت کے انسان مشکلات و آلام کا شکار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بادشاہوں کے استحصالی رویوں اور نظاموں نے انسان کو بے وقعت کر دیا تھا۔ایسے حالات میں ایک حساس طبیعت کے مالک شخص کے جذبات کا منتشر ہونا فطری بات تھی۔

اس حساسیت کی بدولت حسین بن منصور حلاج اس معاشرے کے ان لوگوں کے لیے خطرہ بن گیا جو اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ حسین بن منصور حلاج جیسی پیچیدہ شخصیت پر لکھنا کوئی معمولی بات نہیں لیکن ہمارا ماننا ہے کہ اگر نیت صاف ہو اور مقصد دوسروں کی اصلاح کرنا ہو تو پھر منزل آسان ہو جاتی ہے۔ حسین جو اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے اس نے کبھی بھی مصلحتوں اور روایتوں کو قبول نہ کیا اور نہ ہی اس بناوٹی دنیا میں اپنا دل لگایا۔ جمیلہ ہاشمی نے اس کردار کے ساتھ کافی حد تک انصاف کیا ہے۔ ناول کا آغاز کرتے ہوئے مصنفہ نے شاعری کا سہارا لیا اور اس طرح ناول ''دشتِ سوس'' کے حسن کو چار چاند لگانے میں کامیاب ہوئیں:

"عشق ایک مزرع گلاب ہے اس کی پگڈنڈیاں ان کے لیے ہیں جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں عشق کی نشانیاں توفیق اور مہربانیاں ان کی منزل ہیں اور مجبوریاں غم خاموش اور برداشت کبھی نہ ختم ہونے والا سوز ہمیشگی اور اذیت ناکی اس کی شان ہے اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل جہالت اور وحشت تنہائی اور بے چارہ گردش ہے عشق مزرع زندگی ہے۔"(1)

کوئی بھی ناول جو ادبی و فکری حوالہ سے لکھا جائے تو اس میں انسان کے احساسات، جذبات اور زندگی سبھی کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا ناول ان چہروں سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے جو معاشرے میں مختلف حوالوں سے بڑے متحرک یا غیر متحرک ہوتے ہیں دوسری طرف اگر ناول نگار اپنی تخلیق میں تلمیحات کا استعمال کرتا ہے تو اسے بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں جمیلہ ہاشمی ہمیں دشت سوس کے حوالے سے ایک بلند مرتبے پر فائز نظر آتی ہیں یہی نہیں بلکہ ناول کے گہرے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انھوں نے موت کو زندگی پر ترجیع دیتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ یوں انسان کو حیات جاوداں ملتی ہے۔

اگر ہم اس نکتہ پر غور کریں تو بظاہر ایسا ہونا ممکن نہیں مگر ایسا تب ممکن ہوتا ہے جب انسان انا و انفرادیت سے بڑھ کر سوچتا ہے اور خود کو باتوں اور نعروں میں محبوس ہونے سے محفوظ کر کے ان اقدامات کی طرف عملی اڑان بھر جائے جہاں وہ دعائیہ بن جائے۔ اس ناول کے دیگر کرداروں میں بڑی حد تک نیا پن، جذباتیت، تقلید سے بے رخی، گزرے ہوئے زمانوں میں کی گئی مفاہمتوں اور مصلحتوں سے بے اعتنائی، نئی راہوں پر چلنا، رواجوں اور روایتوں سے دوری اور ظاہری شان و شوکت سے روگردانی ملتی ہے۔

حسین بن منصور کی ذات اور ان سے وابستہ تنازعات اتنے سہل نہیں ہیں کہ جن کو آسانی سے ناول کا موضوع بنایا جا سکے بلکہ اس کے لیے اپنے فن پر قدرت حاصل ہونا بڑا ضروری ہے کیوں کہ کسی حقیقی شخصیت کو اس کی تمام تر نفسیاتی پیچیدگیوں اور کرداری تضادات کے ساتھ لینا

اور پھر کرداری سانچے میں ڈھالنا کہ وہ ناول کے کینوس میں اپنے پورے تاریخی تناظر میں سماجائے کوزے میں دریا سمٹنے کے مترادف ہے۔ حسین بن منصور ایک ایسا انسان تھا جسے روایتی زندگی اور تقلیدی فکر پسند نہ تھی بلکہ وہ جسمانی وروحانی طور پر آزادی کا قائل تھا۔ اسے یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ ایرے غیرے لوگوں کو اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی اجازت دے۔

دراصل حسین بن منصور حلاج اس قربانی یاشہادت کا اشارہ ہے جس کا وجود اسلامی تاریخ کے سنہرے صفحات میں انمول انمنٹ سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف مصنفہ نے حسین کی ذات کے ذریعے یہ سوال بھی اٹھایا کہ ہم آئے دن اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں جو ذلت ورسوائی اٹھا رہے ہیں اور ہم، ہمارے آباؤاجداد اور آنے والی نسلیں غلام ابن غلام بن کر اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کو گروی رکھ رہے ہیں تو یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہے گا۔

ہماری نسلیں کب تک یہ خمیازہ بھگتی رہیں گی، کیا ہمارے معاشرے میں ہمارے ملک میں یا ہماری صفوں میں کوئی حسین بن منصور پیدا نہیں ہوگا جو شناخت ہمارا وقار اور ہماری خود شناسی کو بحال کرتے ہوئے ہمیں ان صلاحیتوں سے مالا مال کردے گا کہ جن کے بل بوتے پر ہم آگے بڑھنے اور ملک دشمن عناصر کے سامنے سیسا پلائی دیوار بننے کے قابل ہو جائیں گے اور اپنی بقا اور ملک کی سلامتی کے لیے ایک ٹھوس لائحہ عمل بنا سکیں گے۔

اکثر لوگوں کی حسین بن منصور کے بارے میں یہ رائے ہے کہ مصنفہ نے اسے بغاوت کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے اور اس کا وجود مکمل طور پر ظاہر نہیں کیا اسی طرح اس کے خیالات وجذبات کو سمجھنا بھی مشکل ہے اور ان سے انقلاب کی جو علامتیں یا لہریں نکلتی محسوس ہوتی ہیں وہ بھی پوشیدہ مبہم ہیں مگر ایسا نہیں ہے کیوں کہ جیلہ ہاشمی نے ناول میں ادب کی چاشنی پیدا کرنے اور ان سے اپنے لیے راہیں متعین کرنے کی آزادی دی ہے کہ اگر ہم معاشرے میں مثبت تبدیلی، نئی سوچ، بیداری اور شخصی آزادی کے ساتھ ساتھ انسان وانسانیت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مقابلہ، بغاوت، انقلاب اور مثالی بننے کی فضا پیدا کرنے کے ساتھ اسے اپنانا بھی ہوگا۔

یوں پہلے سے مرتب کردہ اصول، تحریری قواعد اور حاصل نتائج میں ایسی سفارشات کو اپنانے کے لیے لائحہ عمل طے کرنا آسان ہو جائے گا کہ جن کے ہونے سے دانش، فراست اور تعمیر وترقی کے لیے کردار خود بخود جنم لیں گے اور چار سو پھیلی حیوانیت ختم ہو جائے گی۔ جیلہ ہاشمی نے ناول میں ایسے کردار کو بھی تخلیق کیا ہے جو دین ومذہب سے بیگانہ ہو کر اپنے فرائض کو سرانجام دینے سے سروکار رکھتا ہے۔ یہ کردار ہمارے معاشرے میں موجود ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے اور پرائے کی سوچ سے زیادہ محنت پر یقین رکھتے ہیں، بناوٹ سے پاک اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں۔

ناول کا تعلق ہمارے معاشرے کی اصل تصویر کو ہو بہو پیش کرنے سے ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے کونے کونے میں چھپے یا ظاہر کرداروں کو دکھانا ناول نگار کی ذمہ داری ہے جس میں مصنفہ خاصی کامیاب نظر آتی ہے کہ جس نے محمی جیسے کردار کو تخلیق کرکے ان افراد معاشرہ

کی ترجمانی کی ہے جو مذہبی عقائد، انفرادی مسلک، گروہی نعروں اور فرقہ روایت کو نظر انداز کرتے ہوئے انسانیت کی خدمت کو مقصد حیات جانتے ہیں۔

ناول میں محمی ایک سرائے کا آتش پرست مالک تھا جو مسافروں اور پردیسوں کا خیال رکھتے ہوئے انھیں سہولیات فراہم کرتا تھا۔اس حوالے سے ناول ''دشتِ سوس'' کا یہ حصہ دیکھیئے:

"ایک آتش پرست محمی اس کا مالک تھا۔ محمی لین دین میں ایماندار اور نیاز مند تھا۔اسے مسافروں کے آرام کا بطور خاص خیال رہتا تھا۔جب دشت سوس کی کھلی ہوائیں یخ کرنے والی سردی اسے پریشان کرتیں تو وہ سرائے میں اقامت گزیں لوگوں کے لیے آگ تاپنے اور کوٹھریوں کو گرم رکھنے کا بندوبست کرتا اور اس کے لیے وہ زیادہ دام بھی وصول نہیں کرتا تھا۔لوگ کہتے تھے وہ آتش پرست ہے اس لیے اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر ایسا کرتا ہے مگر وہ ان سب باتوں سے بے پرواتھا۔ گرمی کی شدت میں جب سورج صبح ہی سے بے پناہ تیزی سے چمکتا تو ٹھنڈے پانی کا بندوبست بھی وہ اسی التزام سے کرتا۔ڈھکے ہوئے حوض لبالب ہوتے اور نہانے کے لیے علیحدہ جاری پانی ہوتا۔اس کی طبیعت میں انکساری اور خوف خدا تھا جس کا اعلان وہ کبھی نہیں کرتا تھا۔"(2)

ناول نگار نے جہاں محمی جیسے بے ضرر کردار کو تفصیلاً بیان کیا وہیں ایسے کرداروں کو بھی زور شور سے بے نقاب کیا جن کے نزدیک صرف اپنی کہی ہوئی بات ہی معتبر اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان چیزوں کو بھی سامنے لائی ہیں کہ جو اللہ کے بندوں کو ورغلاتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے دین اور احکامات میں اپنی مرضی وپسند کی باتوں کو شامل کرکے ان معصوم اور سادہ لوح مخلص لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرکے ان کے ایمان کو متزلزل کرتے ہیں۔ایسے لوگ نہ صرف دین اسلام کی بنیادوں کو ہلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ معاشرتی فسادات کا باعث بھی بنتے ہیں۔لہٰذا اس قسم کے مکار وعیار اور جھوٹے لوگوں سے دور رہنا بہت ضروری ہے جو لگے بندھے قواعد وعقائد کے بل بوتے پر انسان وانسان دوستی کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔

یہاں پر ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ان راہوں کے مسافر ہوتے ہیں جہاں شجاعت، مذہب اور محبت کا امتزاج ہو اور جہاں بلند ہمتی واستقامت کا تسلط ہو۔ہمارے معاشرہ میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو ایسے لوگوں کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں جو تفرقہ اور فتنہ پیدا کرتے ہیں لیکن در حقیقت ایسے لوگ گمراہ ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان لوگوں کے برعکس ان افراد معاشرہ سے لو لگانی چاہیے جو اللہ کے نیک بندے اور صراط مستقیم پر چلنے کو ہی عافیت سمجھتے ہیں۔اس ناول میں ان چہروں کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے جو نہ صرف خود شیطانی چالیں چلتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہوئے لڑاو اور مروکی پالیسی پر گامزان کرتے ہیں۔

ہر انسان میں اناو خوداری پائی جاتی ہے اگر بات خوداری تک رہے پھر تو درست ہے لیکن اگر انسان اناو انانیت کا پرچار ہی شروع کر دے تو پھر معاشرہ تعمیری ہونے کے بجائے تخریبی بن جاتا ہے۔دشت سوس میں بھی حسین بن منصور حلاج سے پہلے کے عہد میں اور اس کے اپنے عہد میں بھی ایسے فرقے موجود ہیں جو اللہ تعالی کے بنائے گئے قوانین میں ترامیم و تبدیلی کر کے اور پھر ان کے حوالے دے کر خود ساختہ قواعد وضوابط ،اقدامات اور فرمودات کو عام کرتے ہوئے جنگ وجدل کی کیفیت پیدا کرتے اور ابلیس کو خوش کرتے تھے۔یہ لوگ ایسی شیطانی چالیں چلنے اور وہ اول فول منہ سے بکتے کہ لوگ ان پر یقین کر لیتے تھے اور یوں یہ مرتد افراد عوام الناس کے عظیم لیڈر کہلائے جاتے تھے۔ایسے لوگوں کے حوالے سے ناول ''دشتِ سوس'' سے لیا گیا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "دنیا شور شوں سے پر ہو گئی تھی۔ہمیشہ سے تھی،نئے فتنے پرانے رنگوں کے لبادے اوڑھ کر سر اٹھاتے تھے۔قرامطہ اور معتزلہ اور صاحب الزنج وہ اسلام میں موشگافیاں کرتے تھے اور دنیا کی محبت میں دیوانے تھے۔انہوں نے نئی شریعتیں رواج دی تھیں اور نئے فلسفے تعمیر کیے تھے۔وہ عقل ودانش کی روباہی سے دنیا پر مسلط ہو جانے کے خواب دیکھتے تھے اور مال ودولت پر جان دیتے تھے۔انہوں نے نئے مذاہب کی بنیادیں رکھی تھیں اور نئے کلمے ایجاد کیے تھے،وہ قرآن کا جواب لکھتے تھے اور خدا کو اس کے کلام میں (نعوذ باللہ) شکست دینا چاہتے تھے۔انہوں نے سحر کے زور سے اپنی طاقتوں کو میقل کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر وہ دلیر ہو گئے تھے۔ایسے گیدڑوں کی طرح جو شیر کی کھال پہن کر جنگل کے قانون کو ہاتھ میں لے لیں۔انہوں نے خلقت میں فتنے پیدا کیے تھے اور ہزاروں سادہ لوح لوگوں کی گمراہی اور موت کا سبب ہوئے تھے۔"(3)

ناول معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس میں کسی بھی معاشرے کی معاشرت چھپی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس معاشرے کے جو بھی کردار واعمال ہوتے ہیں وہ ایک ناول میں درج کیے جاتے ہیں یا درج ہوتے ہیں۔بعض اوقات ادیب یا مصنف اپنی مرضی یا پسند سے ایسے حالات وخیالات قلمبند کرتے ہیں جو ظاہری طور پر ضمنی کرداروں سے جڑے ہوئے محسوس نہیں ہوتے لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ان ہی لوگوں یا چہروں کی ہو بہو تصاویر ہیں جو ظاہر یا باطن میں مختلف حالتوں میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

ناول نگار تصویر کے ایک رخ میں خوشی وراحت کی کیفیت کو پروئے گا تو دوسرے رخ میں کہیں نہ کہیں حزن وملال کا ذکر بھی کرے گا کیوں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ناول اپنے عہد کے صرف خوش کن یا صرف غمگیں حالات کو بیان کرے۔یہی وجہ ہے کہ ایک معیاری ناول میں اداسی ومسرت،امیدی وناامیدی یہ سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔جن معاشروں میں اعلیٰ عہدے داران عوام کی مشکلات اور پریشانیوں کو سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور عوام کے خیالات وجذبات کو مقدم نہیں رکھتے تو پھر ایسے معاشروں میں اداسی ،بے چینی،کرب،بے ثباتی اور انتشار کی صورتحال جنم لیتی ہے اور یوں بغاوت کا علَم بلند ہوتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے دشت سوس میں ایسے خیالات و تفکرات کی نشاندہی کی ہے کہ جن کی وجہ سے بے ثباتی و تنہائی کی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔بلاشبہ انسان کے اندر کا نفس اور اس کی نفسانی خواہشات نہ صرف خود انسان کے لیے باعث نقصان ہیں بلکہ معاشرتی بگاڑ کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔اگر افراد معاشرہ اپنے نفس کو قابو میں رکھیں تو کبھی غیر یقینی صورتحال پیدا نہ ہو مگر ایسا کرنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔انسان کا نفس اس کی زندگی کو تماشہ بنا دیتا ہے جس کی وجہ سے ہم خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے غلط راہ کا ارتکاب کرتے ہوئے پستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور خود کو ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں قید کروا دیتے ہیں۔اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی پانے کے لیے ہم خیر و شر میں تمیز تک کرنا بھول جاتے ہیں اور اپنے مذہب تک کو دنیاوی کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔

ہمارا یہ تو پکا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واحد و یکتا ماننا ہے لیکن کیا کبھی ہم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ وہ غفور رحیم ہم سے راضی بھی ہے یا نہیں کیا زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ہمارا ہر حد کو عبور کر جانا انصاف کی بات ہے کیا ہمارے پیارے نبی ﷺ اور خداوند کے احکامات ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنی دنیاوی زندگی اور امور کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے دینی تعلیمات کا غلط استعمال کر کے فائدہ اٹھائیں اور جب ہمارا کام نکل جائے تو پھر ہم احکامات خداوندی اور ارشادات نبوی ﷺ کی پیروی کو چھوڑ دیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایک بالکل غلط نظریہ ہے۔

مصنفہ نے اس ناول میں کافی جگہ پر اس صورتحال کو ظاہر کیا ہے کہ بظاہر علما و مفکرین کس طرح حقائق کو مسخ کر کے اور اپنے چہروں پر بناوٹی رنگ سجا کر عام عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ناول کا مرکزی کردار حسین بن منصور بھی ایسے لوگوں سے بہت نفرت کرتا تھا جن کے ظاہر و باطن الگ الگ تھے۔وہ ایسے منافق لوگوں کے دوغلے پن سے بیزار رہتا تھا اور یہ سوچ اسے پریشان کرتی تھی کہ یہ کیسے دین اور خدا پسند ہستیاں ہیں کہ اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو شہ دینے کے لیے اللہ و اسلام کے احکامات کا علم بلند کرتے ہوئے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔اس ضمن میں ناول ''دشتِ سوس'' کا یہ حصہ دیکھیے:

> "منصور نے اس کے باوجود کہ کسی کے عقائد میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔سوچا کرتا کہ یہ اچھی بات ہے کہ اپنے خداؤں کو یہ لوگ یوں ہمراہ رکھتے ہیں۔یہ ان کے تابع ہوتے ہیں کہ جب جی چاہا ان کو نکالا جھاڑ پونچھ کر سامنے سجا لیا۔دعا کی، ہاتھ جوڑے، مراقبے کی سی کیفیت میں رہے پھر اپنی زندگیوں کو وہیں سے جوڑ لیا جہاں سے چلی تھی۔ان کے نزدیک مذہب عام زندگی میں روزمرہ کا کام آ سکے بس اسی قدر کافی ہوتا ہے۔"(4)

حسین بن منصور بچپن سے ہی انوکھا اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل بچہ تھا۔جمیلہ ہاشمی نے اس غیر فانی اور معروف صوفی کردار کے مختلف روپوں یعنی بیٹا، باپ، خاوند، پوتا، ہیرو اور پھر سب سے بڑھ کر عالمگیر انسان کے حوالے سے ظاہر کیا ہے۔مصنفہ نے صدائے ساز میں حسین کی غیر معمولی صلاحیتوں کو بارہا بیان کیا ہے۔

جب محمی جو کہ حسین کا دادا ہے اپنے بیٹے اور پوتے سے ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوتا ہے تو راستے میں اس کی ملاقات ایک درویش سے ہوتی ہے جو محمی کو بتاتا ہے کہ اسے ہوا کے زور نے یہاں لا پٹخا ہے اور پھر بگولے کی شکل میں وہ محمی کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو جاتا ہے جس پر محمی خوفزدہ ہو جاتا ہے اور اس بات کا ذکر اپنے بیٹے منصور سے کرتا ہے تو حسین اپنے دادا سے اس ملاقات کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اسے ناول ''دشتِ سوس'' میں کچھ اس طرح سے قلمبند کیا گیا ہے:

> "حسین نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا" دادا آپ حیران نہ ہوں عرش سے لے کر فرش تک سمجھ میں نہ آنے والی طاقتیں ہیں"۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ راہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے"؟ محمی نے پیار سے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا، حسین ہنسا، بہت کچھ جانتی ہوئی پراسرار سی مسکراہٹ اور اپنی انکھوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔ مجھے دکھائی دیا تھا جب اس نے آپ کے خچر کی لگام تھامی تھی، آپ کا راستہ روکا تھا اور پھر رقص کناں گم ہو گیا تھا۔"(5)

جمیلہ ہاشمی نے ناول دشت سوس میں ویسے تو بہت سے مقامات پر لیکن بالخصوص حسین بن منصور کے حوالے سے نئے امکانات ،جدید راستوں کی شناخت، جذباتی وخیالی احساسات اور تخیلاتی پرواز جیسے رجحانات کا ذکر بکثرت بیان کیا ہے۔ دراصل حسین ایک ایسا درویش صفت انسان تھا جو اللہ تعالیٰ کی سچی محبت و معرفت میں انتہا کی حد تک ڈوبا ہوا تھا اور یہی عشق اللہ تھا کہ جس کی وجہ سے وہ دنیاوی کھیل تماشوں سے کوسوں دور تھا۔

اس دور کے ایسے تمام افراد جو عام تھے یا پھر اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے سبھی تقریباً مصلحتوں، ضرورتوں اور امیدوں میں بندھے ہوتے تھے اور مختلف نقابوں کا سہارا لے کر خود کو اور اپنے مکروہ عزائم و خواہشات کو چھپائے ہوئے تھے جب کہ ان کے برعکس حسین بن منصور حلاج عرفان نفس سے بڑھ کر شناخت کبریا تک رسائی کو اپنا مقصد و مرام خیال کرتا تھا، وہ ان تمام درجات کو پانا اور ان تمام منازل تک جانا چاہتا تھا جہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اپنی تقدیر خود لکھے۔

جب حسین بن منصور ان دیکھے محسوسات کی کوئی غیر معمولی بات کرتا تو زیادہ تر لوگ اس کی ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے طرح طرح کے الزامات لگاتے تھے اور اسے معاشرتی فتنہ قرار دیتے تھے۔ حسین کی انوکھی باتوں کی وجہ سے لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ حسین جب اپنے والد منصور سے ملتا ہے تو اسی نوعیت کی باتیں کرتا ہے اس ضمن میں ناول ''دشتِ سوس'' سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھئے:

> "اقصائے عالم میں ہواؤں کی طرح آزاد گھومنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ ہواؤں پر حکمرانی کرنے کو بادلوں پر سوار ہونے کو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں میں کیا کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں میرے بازو پھیلیں تو مشرق اور مغرب کو چھو لیں۔ برفانی چوٹیاں میرے قدموں میں ہوں۔ کوہسار

میرے زیر نگیں ہوں۔عرش کی نیلاہٹ ستاروں کی جگمگاہٹ کو چھو کر دیکھوں۔دنیا میرے قدموں تلے سمٹ جائے۔فاصلے ایک نقطے کی طرح ہوں۔"(6)

ہم جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں ایسے رویے کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگ خود سے بے خبر ہیں یا بے خبر ہونے کی فنکاری کر رہے ہیں۔ایسے لوگ خود کو اعلیٰ وارفع جب کہ باقی مخلوق خدا کو ادنی سمجھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ بزرگ وبرتر کے ہاں اعلیٰ وادنی کا معیار صرف اور صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔کسی بھی معاشرے کی امن وآشتی کے لیے اس معاشرے میں عدل وانصاف اور احترام آدمیت کا ہونا لازم ہے بہ صورت دیگر معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔

اس ناول میں بھی مصنفہ نے بے شمار مقامات پر انسانیت سوز واقعات کا ذکر کیا ہے۔جس طرح عہد گذشتہ میں مظلوم و مجبور لوگوں کے حقوق پامال کر کے ان کو باعث عبرت بنانے کے لیے سر عام ذلیل ورسوا کیا جاتا تھا ویسے ہی عہد حاضر میں بھی نسلوں کو برباد کرنے کے لیے یہ گھٹیا کھیل جاری وساری ہے۔

ہمارے معاشرے میں پرانے زمانے کی طرح بہت سے لوگ موجود ہیں جو جھوٹی باتوں ،الزام تراشیوں اور قتل غارت کے ذریعے حیوانیت کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ناول میں بھی جابجا جبر و تشدد کے نمونے پائے جاتے ہیں جن کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسانیت سوز واقعات کس طرح معاشرے کی ترقی کے لیے زہر قاتل ہیں اور ان کو بڑھاوا دینے میں اور فعال کرنے میں کون کون سی ہستیویوں کا عمل دخل ہے۔

ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم خود کو افضل اور دوسروں کو حقیر جان کر ان سے نفرت آمیز رویہ اختیار کریں۔جمیلہ ہاشمی نے دشت سوس میں بغدادی معاشرے میں اسی قسم کے رویے کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔اس حوالے سے ناول "دشتِ سوس" کا یہ حصہ پڑھیئے:

"یہ تماشوں سے بھرا شہر تھا۔جہاں حسین تھا۔ایک مکمل دنیادار دھوکہ دہی اور فریب کے سبق سیکھتا ہے۔دربار کی بھیڑ میں لوگ ایک دوسرے کو پھلانگ کر کس طرح بڑھتے تھے،پاؤں میں روندتے ہوئے۔یہاں کوئی جذبہ،کوئی خیال،کوئی بات بھی اصل نہ تھی۔پُر نخوت،پُر غرور بغداد کے باشندے جن کو سچ سے دشمنی تھی اور جو اپنے شہر کو سارے جہاں سے اعلیٰ اور اپنے آداب کو عمدہ جانتے تھے۔اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے مگر چوں کہ یہاں اجنبیوں کی زیادہ بھیڑ تھی اس لیے ان سے نفرت کرتے تھے۔"(7)

اس ناول میں بار بار ایسے کرداروں اور ہستیوں کی دریافت کو ممکن بنایا گیا جو شخصیت کے لحاظ سے دورخے ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو اگر دوغلا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔یہ لوگ مختلف پردوں کی آڑ لے کر اپنے ناپاک عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔عوام کو بے وقوف بنانا اور ان کی سادگی سے کھیلنا ان لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے۔

ویسے بھی بہ ظاہر کچھ اور کرنا اور باطنی طور پر عجب کھیل رچانا آج کل ہنر مندی کہلاتا ہے۔ عیاری اور دھوکہ بازی ایک ایسا کھیل بن چکا ہے کہ جسے عام سے عام بندہ بھی بطور فنکاری اپناتا ہے بلکہ بلاشبہ معاشرے میں ایسے ہی لوگوں کو عزت بخشی جاتی ہے لیکن یہی لوگ اپنے جاہ و جلال اور مقام و مرتبے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان کا روپ دھار لیتے ہیں اور کسی بھی تنظیم یا گروہ کے کارندے بن کر بربریت کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں بڑے معصوم نظر آتے ہیں لیکن جب اپنے حلقہ احباب میں جاتے ہیں تو ناموس بندگان پر خندہ زن ہو کر دشنام طرازی کرتے ہیں اور یوں انسان و انسانیت کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں ایسے ریاکار اور بے ضمیر لوگوں کے چہروں سے پردہ اٹھاتے ہوئے ظاہری سفید لباسوں میں ملبوس کرداروں کو اچھی طرح آشکارہ کیا ہے۔ ایسے کردار بظاہر نیک اور پارسا ہوتے ہیں، مساوات اور عدل و انصاف کے نام لیوا پکارے جاتے ہیں، حق و صداقت کے علمبردار بن کر درویشی و فقیری کے مرتبہ پر افضل تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو قتل وغارت، سفاکیت، حیوانیت اور ضمیر فروشی میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ جمیلہ ہاشمی ایسے افراد و کرداروں کو ہمارے سامنے لاتی ہیں جو معاشرتی بربادی کا باعث بنتے ہیں کیوں کہ ان مکار لوگوں کی وجہ سے دیگر مجبور لوگوں کی زندگیاں بے بسی کا شکار بن جاتی ہیں۔

ایسے لوگ کسی بھی معاشرے میں انسان کہلانے کے لائق نہیں ہیں جو انسانیت کی فنا میں اپنی بقا سمجھتے ہیں۔ ایسے افراد کو معاشرے کا ناسور کہنا اور انھیں درندے اور بھیڑیے جیسے القابات سے نوازنا بے جا نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مصنفہ نے ناول ''دشتِ سوس'' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "وہاں تو صرف دریا ہی ایسے ہوتے ہیں تمہارے یہاں تو اور ہی تماشا ہے، کسی نیک اور بزرگ کو خدا رسیدہ اور معصوم سمجھو تو وہ کسی نہ کسی مذہب کا داعی، حکومت کا باغی، کسی اور مذہب کا مبلغ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران تقریباً ہر گام پر مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جن کی آنکھیں اندر دیکھتی ہوئی، شکلیں سادہ مگر کردار نہایت خوف ناک تھا۔ قتل اور غارت گری ان کا پیشہ ہے۔ ہر قدم پر دھوکہ فریب، سلطنت کے خواب لیتے ہوئے آدمی، رقص کرتے ہوئے خداشناس درویش اور خلافت کے نہایت شدید دشمن۔ آل علی کا نام لے کر علم کی آڑ میں ظلم و تشدد کرنے والے۔ مجھے کم از کم بیس سال اس گردونواح میں گھومتے ہو گئے ہیں مگر اس زمانے سے زیادہ پریشان زمانہ میں نے نہیں دیکھا، راستے غیر محفوظ، شاہرائیں پُر خطر اور موڑ پر کوئی نہ کوئی خوف گھات میں۔ تمہارے مذہب میں اتنے مختلف خیالوں کے لوگ جمع ہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے اور جان سے مارنے کے درپے ہیں۔"(8)

اس ناول میں اکثر مقامات پر اللہ تعالیٰ پر کامل یقین وایمان اور صوفی ازم پر بھی گفتگو ہوئی ہے۔مصنفہ نے اگر شیخ کامل، پیرو مرشد، منصور حلاج اور حسین کا ذکر کیا ہے تو ساتھ میں ضروری استعارہت یا جزئیات کا سہارا لے کر اپنی بات مکمل کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔بہت سے مقامات پر دنیاوی اور اخروی محبت وچاہت پر سے پردے اٹھائے گئے ہیں۔یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ بہت محنت سے چلے کاٹنے پر منزل یا وصال نصیب میں لکھ دیا جائے بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سادہ اور فقیر لوگ جو ریاضت نہیں بھی کرتے تو بھی ان عہدوں پر فائز کر دیے جاتے ہیں کہ جن کا تصور کسی اور نے تو کیا خود انھوں نے بھی نہیں کیا ہوتا۔

اس ناول میں منصور حلاج جب شیخ کامل سے ملاقات کے دوران مختلف امور پر بات چیت کرتے ہیں تو ایسی ہی رسانیوں سے پردے اٹھتے ہیں۔جب منصور حلاج حج پر جانے کی خواہش کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے متعلق شیخ کامل کو بتاتا ہے لیکن بیت اللہ جانے کی تڑپ سب چیزوں پر حاوی ہوتی ہے تو وہ شیخ کامل سے اس زیارت پر جانے کے لیے دعا کی استدعا کرتا ہے تو جن الفاظ میں شیخ کامل منصور کو تسلی ودلاسہ دیتا ہے اور شیخ منصور کو یاد دلاتا ہے کہ اس پر اللہ کا خصوصی کرم ہے اور رب رحیم نے اسے خصوصی انعام و کرام سے نوازا ہے لیکن منصور کے دل کی حالت بڑی عجیب ہوتی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عشق میں بے چین و بے قرار ہوتا ہے جسے ناول ''دشتِ سوس'' میں اس طرح سے بیان کیا گیا:

> "شیخ کامل کی آواز آئی: "ابو حسین دیکھو"۔منصور نے ان کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا جیسے پردے اور حجاب اور راستے اور زمین سب کیشف سحاب اٹھ جائیں۔آئینے کی طرح ہر شے دکھائی دے۔اسے اپنے سامنے روضہ رسول ﷺ دکھائی دیا۔مسجد نبوی، حضرت عائشہ صدیقہ کا حجرہ مبارک،اور نور اس پر منکشف ہوا، جیسے در وا ہو جائیں، ساری پستیوں اور بلندیوں سمیت راسے کشادہ ہو جائیں۔اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔اس کے قلب کو قرار آیا۔اس کی روح سیر اب ہوئی۔وہ شاد کام ہوا۔اس کی نظر فراخ ہوئی اور اس کی نگاہ نے جو دیکھا سو دیکھا۔"(9)

جمیلہ ہاشمی نے ناول دشت سوس میں ابن منصور کے عہد کے سیاسی اور معاشرتی انتشار اور دار لحکومت بغداد کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس تلخ حقیقت سے روشناس کروایا ہے کہ جب قومیں زوال کا شکار ہوتی ہیں تو اسی قسم کے انتشار سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔

اکثر اوقات اس صورتحال میں قومیں اپنے آپ پر اور بعض اوقات تو خدا پر بھی بھروسہ چھوڑ دیتی ہیں اور ایسی بزرگ ہستیوں کی پیروی شروع کر دیتی ہیں جو اپنی کرامات سے انھیں فائدے پہنچا سکیں۔ایسا ہی کچھ سلسلہ ناول میں حسین بن منصور کے ساتھ بھی دکھایا گیا ہے کہ وہ حاجت روا، اور پوشیدہ باتوں کا علم رکھنے والا مشہور ہو گیا۔اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ جس کی طرف ایک مرتبہ بھی دیکھ لے اس کا مقدر بدل جاتا ہے۔

اس ضمن میں اس کی شہرت ہر خاص وعام تک پہنچ گئی یہاں تک کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگے۔ناول میں بیشتر مقامات پر دیومالائی ارشادات و مخصوص طرز احساس سے آراستہ وپیراستہ جذبات وافکار بھی پڑھنے کو ملتے ہیں اور کافی پر شکوہ بیانات ومحبت کے امتزاج پر مبنی شدید احساسات کا اظہار بھی موجود ہے۔ حسین بن منصور کی ذہنی سطح بھی تخیل وروحانیت سے پر ملتی ہے حتیٰ کہ وہ ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے کہ جن کو سن کر عقل دنگ رہ جاتی تھی اور دماغ ماننے سے انکار کرتا تھا۔یعنی کہ اس کی سوچ ظاہری صورت اور موجودہ وقت سے بہت آگے تک کا سفر کرتی تھی۔

میری ناقص رائے کے مطابق ناول پڑھ کر حسین کی سوچ وفکر پر عام آدمی اپنی رائے نہیں دے سکتا کہ آخر حسین کس طرح کی شخصیت کا مالک تھا۔وہ حق پہ تھا یا نہیں وغیرہ۔مصنفہ نے انتہائی پرکاری سے حیات وہستی، محبوب ومحب، فنا ورضا، مقصود ومطلوب، احساس وجذبہ، شوق واختیار اور حاصل وماحاصل کی ایسی ایسی گھتیاں حل کی ہیں کہ انسانی فکر یقینی طور پر تخلیق کار کے بس میں محسوس ہوتی نظر آتی ہے۔حسین بن منصور کی شخصیت میں ایک عجیب سی پُراسریت پائی جاتی تھی۔وہ نہ صرف لوگوں کے دلوں کے حال جان لیتا تھا بلکہ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بھی بتا دیتا تھا۔محلوں میں رہنے والے، پیدل اور سوار، عمر رسیدہ اور جوان، بیمار اور تندرست الغرض ہر کوئی اس سے مرغوب نظر آتا تھا اور اسی کے سامنے دست سوال بھی۔اس حوالے سے ناول ''دشتِ سوس'' کا یہ پیراگراف دیکھئے:

> "لوگ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ کسی سے بات نہ کرتا۔وہ درپئے جاناں تھا۔مہینوں یوں ہی گزر گئے اور لوگ اسے گم سم مگر فرزانہ دیکھتے۔لوگوں کو اس کی تلاش رہنے لگی۔مجمع اس کے گرد بڑھنے لگا،لوگ اس سے دعا کے طالب ہوتے۔اس سے اپنی حاجتیں کہتے،وہ کسی کو کاغذ پر لکیریں سی کھینچ دیتا۔کبھی سیاہی سے کچھ آڑے ترچھے حروف بنا دیتا۔لوگوں نے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔لوگ اسے کوئی عظیم بزرگ سمجھتے،اس کی بددماغی، کم گوئی کو بھی ایک دلبرانہ انداز سمجھتے۔اس کی لاپروائی وبے نیازی کو بھی ایک شان محبوبی جانتے۔"(10)

ہماری تاریخ بے شمار انوکھے واقعات اور تاریخی کرداروں سے بھری پڑی ہے کہ جن کے ہاتھوں سے جو بھی کچھ ہو جاتا ہو وہ امر ہو جاتا بالکل اسی طرح حسین بن منصور بھی ایک ایسی ہی تاریخی شخصیت ہے جس کے حوالے سے بہت سے کمالات،مشاہدات اور مطالعات تاریخی وتحقیقی کتب میں پائے جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے اس نے تاریخ میں ایک عظیم ہیرو کی حیثیت اختیار کی۔

حسین بن منصور کے نادر خیالات میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ تطہیر نفس وتزکیہ حیات تب تک ممکن نہیں جب تک گناہ اور شرک کا ہونا مٹ نہیں جاتا۔وہ شیطان کو انسان کی دائمی انبساط وابدی سرخروئی کے لیے ایک بنیادی محرک خیال کرتا تھا کہ جب تک انسان شیطان مردود سے مقابلہ نہیں کرتا اور اس کی باتوں، گمراہوں، راہوں اور دیواروں کو شکست نہیں دیتا تب تک کامیابی ممکن نہیں ہے۔

حسین بن منصور کی ایسی باتوں کی وجہ سے اس پر کفر والحاد کے فتوے بھی لگے اور اسے دیوانہ اور مجنوں بھی کہا گیا لیکن اس کے باوجود بھی نہ صرف وہ اپنے عہد بلکہ اس کے بعد آنے والے ہر عہد سے لے کر دور حاضر تک حق وسچ کا شیدائی مانا جاتا رہا اور لوگ اسے قابل فخر شخصیت اور ہیرو و

قرار دیتے ہیں۔اگر زمانہ ماضی سے لے کر زمانہ حال تک کا مشاہدہ کیا جائے تو اس وقت سے تا حال بہت سے افراد و کردار ایسے ہیں جو شیطان کو انسان وانسانیت کی بقا کے لیے نجات دہندہ تسلیم کرتے ہیں۔

اس ضمن میں اگر ہم اپنے قومی شاعر ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کو ہی پڑھ لیں تو ان کے کلام میں جا بجا ان خیالات کا اظہار پایا جاتا ہے کہ شیطان کا وجود انسانی فتح کے لیے نیک شگون ہے۔ان کے خیالات وافکار نے یہ ثابت کیا ہے کہ ابلیس نے مسلمانوں کے سامنے خواہشات، خوابوں، ملوکیت، سرمایہ داری، سلطانی، سیاسی، تہذیبی، غلامی، سرداری اور درویشی بحثوں کا ایک طویل سلسلہ سجا رکھا ہے اور آج کے مسلمان جب تک بیداری، بہادری، خودداری، قرآنی، محمدی ﷺ اور خداوند اسباق کو دل و عمل میں جگہ نہیں دیں گے تب تک کامیابی و کامرانی کا حصول بہت مشکل ہے۔

حسین بن منصور نے بھی زمانوں پہلے یہی سبق دیا تھا کہ شیطان بذات خود دھتکارا ہوا ناپاک اور نجس وجود ہے لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے نہ صرف بے شمار علوم وفنون سے نوازا تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب فرشتہ بھی تھا اور دیگر فرشتوں کے ساتھ محوِ پرواز رہتا تھا لیکن اپنی ایک غلطی کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا اور آج وہ نہ صرف انسان بلکہ تمام انسانیت کا ایک سفاک دشمن ہے اور انسانوں کو سرکشی، نافرمانی اور نیک کاموں کو نہ کرنے اور بگاڑنے میں مصروف ہے لیکن شیطان کو اس کے ناپاک ارادوں میں ناکام کرنا یقیناً ہمارے بس میں ہے۔

ہم اس کے منصوبوں کو اتباع رسول ﷺ اور اتباع رب رحیم کے ذریعے خاک میں ملا دیں سکتے ہیں لیکن ایسا تب ممکن ہے کہ اگر ہم سب سے پہلے اپنے نفس پر قابو رکھیں۔یوں حسین بن منصور کا یہ کہنا کہ ابلیس کا وجود ہی انسان کو فتح دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے کچھ غلط نہیں ہے لیکن افسوس کہ اپنے اس قول کی وجہ سے وہ انسانوں میں انسان دشمن بھی قرار دیا گیا اور اسی وجہ سے نفرت کی بھینٹ چڑھا کر سنگساری اس کا مقدر بنادی گئی۔

جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور کے ان افکار کو ادب کی چاشنی میں گھول کر ناول ''دشتِ سوس'' میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا اور منصور کے خیالات کو اس طرح آشکارہ کیا:

> "جبل شیطان پر پہنچ کر آقائے رازی نے کہا؟ یہ وہ جگہ ہے جہاں جنگ احد کی گھڑی شیطان نے چلا کر کہا تھا، تمہارے نبی شہید ہوگئے۔شیطان نے یہ نہیں کہا ہوگا وہ تو شہادت پر یقین ہی نہیں رکھتا حسین نے کہا۔مگر میں کیسے کہوں اپنے منہ سے جو بات شیطان نے کہی تھی۔شیطان جو انسانوں کو گمراہ کرنے والا اور غلط راہوں پر ان کی رہنمائی کرنے والا تھا۔آقائے رازی نے کہا۔وقت کے کسی گوشے میں شیطان بھی ایک فرشتہ تھا۔سب سے زیادہ عبادت گزار، قریب تر، حسین نے مسجد فتح میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔دنیا میں کتنا امن ہوتا اگر شیطان نہ ہوتا۔آقائے رازی نے کہا۔آقائے رازی یہ ساری رونق اس کے دم سے ہے۔اگر گناہ کا تصور نہ ہو تو آدمی کس شے سے بچے، شیطان نہ

Tarjihaat
Volume:IV
Issue: III
مارچ ۲۰۲۴
March. 2024
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
Online Research Jornal

ہو تو ابن آدم فتنوں سے محفوظ کیسے رہے۔ حسین نے حیرت زدہ آقائے رازی کو بتایا۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو۔ سب نے کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا وہ راندہ درگاہ ہوا عرش سے نکالا گیا خوار ہوا۔انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لئے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔ اگر وہ نا ہوتا تو کوئی گمراہی میں مبتلا کیوں کر ہوتا اور یہ سوزو ساز حیات ہی نہ ہو تو جنت نہ ہو اس کی تڑپ نہ ہو۔اس کے حصول کے لیے کدو کاوش نہ ہو۔ایک طرح سے تو وہ محسن ہے۔"(11)

جمیلہ ہاشمی اپنی اس تخلیق میں مختلف موضوعات کو زیر تحریر لائی ہیں اور فنا، جزا، قضا، زندگی، موت، محبت، فقیری، غنائیت، روح اور باطن جیسے عنوانات پر بھی حسین بن منصور کے ذریعے سے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس ناول میں مذہبی و اخلاقی قدروں کی لے دے اور نزاکت ونفاست سے پر حسن فطرت کی دل آویزاں اکثر جگہوں پر ساتھ ساتھ دیکھی جاسکتی ہیں۔

کوئی بھی پُر امن معاشرہ اس بات کا متحمل نہیں ہوتا یا ہو سکتا کہ جہاں انسان دوستی کو تخریب کاری کا نشانہ بنا کر ایسے قوانین لاگو کر دیئے جائیں جو انسانیت کی بجائے حیوانیت کو پروان چڑھائیں کیوں کہ ہماری تاریخ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں انصاف ومساوات کی جگہ طوائف الملوکی اور قرابت داری عام ہوئی تو اس معاشرے میں چاروں اطراف تباہی وبربادی اور افراتفری نے جنم لیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں حسین بن منصور کے حوالے سے باقاعدہ طور پر تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ مشہور حوالوں اور باتوں کو بھی تشت از بام کیا ہے۔ایسے معاشرے بدترین معاشرے کہلاتے ہیں جہاں لوگوں کو اپنے حقوق کا تو پتہ ہو لیکن دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض ادا کرنا بھلا دیا جائے بالخصوص جب اپنے ہی اپنوں کو دھوکہ دیتے ہیں تو تب مایوسی اور مادہ پرستی عام ہو جاتی ہے اور معاشرے کے افراد گمراہی کی راہوں پر چلتے ہوئے ایک قسم کے شیطان بن جاتے ہیں کیوں کہ دھوکہ، عیاری، چالبازی، جھوٹ، فریب اور اسی قسم کی دوسری باتیں شیطانی خصائص ہیں مومن کی نشانیاں نہیں ہیں۔

جن معاشروں میں یہ ابلیسی صفات پائی جاتی ہیں وہاں فتنے وفساد اور انوکھے تماشے برپا ہوتے ہیں اور یوں انسانیت نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ناول دشت سوس میں جابجا ایسی عبارات نظر سے گزرتی ہیں جن میں حقوق و فرائض اور عہدوں و حکومتوں کی زوال پذیری پر سے پردے اٹھتے ہیں۔

اس ضمن میں ناول ''دشتِ سوس'' میں خلاف عباسیہ کی صورتحال ملاحظہ کیجئے:

"خلافت عباسیہ اب اپنے وقار کی آخری سانس لے رہی ہے اور ایک نہایت بدترین شخصی طوائف الملوکی کا دور ہے۔آپ کو شاید معلوم نہیں کہ دربار پر ایسے امرا قابض ہیں جو اپنی ہر جائز اور ناجائز بات منوانے کے لیے اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔فوج کی ابتری، عمائدین سلطنت کی بے حسی اور بے بسی پھیلی ہوئی سرحدوں کی طرف سے بے رخی حکومتوں کے زوال کی نشانیاں ہیں۔ پھر مشرق و مغرب

میں نئے نئے فتنے اوران کو ختم کرنے کی طرف سے چشم پوشی اس بات کی دلیل ہے۔عوام کے
مسائل اوران کی حالت کی طرف سے مکمل اغماض۔" (12)

ناول دشت سوس کو اس کی ہیتی ترتیب کے حوالے سے مصنفہ نے اسے حسین بن منصور ایک غنائیہ کا نام دیا ہے۔اس ناول کے تینوں حصوں جن کے ناموں کا ذکر ابتدائی صفحات میں موجود ہے کو اس اعلیٰ فنکاری سے ایک دوسرے میں پرو دیا گیا ہے کہ نہ تو فطری بہاؤ بے ترتیبی کا شکار ہوا اور نہ ہی وجدانی کیفیات عقلی توازن قائم رکھنے میں رکاوٹ ثابت ہوئیں۔اس ناول میں جو واقعات بیان کیے گئے انہیں باریک دھاگوں کی صورت میں بنا گیا اور ایک دلکش سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

حسین بن منصور کے مخصوص فکری تناظر کی روشنی میں تحریر کردہ اس ناول میں جمیلہ ہاشمی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ عشق مرزع گلاب بھی ہے اور مرزع زندگی بھی لیکن کبھی کبھی یہ اپنی جان سے گزر جانے کا نام بھی بن جاتا ہے۔مصنفہ نے تاریخ کے باطن سے بہترین مواد حاصل کرتے ہوئے دلکش اور خوبصورت اسلوب میں ایک ایسا ناول یا فن پارہ تخلیق کیا ہے جس میں تخیل کی مناسب پرواز کے لیے فضا کشادہ نہیں۔اس ناول کو جمیلہ ہاشمی کے جمال فن کا شاہکار کہنا غلط نہ ہوگا کیوں کہ انھوں نے حالات وواقعات کی مناسبت سے اس ناول میں شعور کی رو، فلیش بیک، خطوط، ڈائری، سوانحی اور بیانیہ طریقہ ہائے کار کو اپناتے ہوئے فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے منصور ابن حلاج کے کردار کو تخلیق کرنے میں بڑی محنت ومہارت سے کام لیا ہے۔اگر غور کریں تو ایک طرف منصور کے والد محمی ہیں جو آتش پرست ہیں جب کہ دوسری طرف ان کا نومسلم بیٹا منصور ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں تجسس کے ساتھ ساتھ قصہ میں مسلسل ارتقا بھی ملتا ہے۔الغرض کہ حسین بن منصور جیسی تاریخی لیکن متنازعہ شخصیت کو اپنی تمام تر پراسراریت سمیت ہمارے سامنے زندہ لا کھڑا کیا ہے۔

اس ناول میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے اور اگر کچھ باقی یا لافانی رہے گا تو وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات اور نام ہے۔دنیا کی بے ثباتی اور زندگی سے مربوط بے قراری انسان کے اندر ایک ہلچل مچائے ہوئے ہے۔باوجود اس کے کہ ہم نے صدا اس دنیا میں نہیں رہنا لیکن پھر بھی ہم تعمیر و تعبیر، آج و کل اور مستقبل کو سنوارنے کے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

افراد معاشرہ زندگی کو پانے اور اسے دائمی وخوبصورت بنانے میں مصروف ومشغول ہیں لیکن آج کے دور میں بھی کچھ خدا کے بندے ایسے ہیں کہ جو موت کو حقیقت اور برحق مانتے ہوئے عبادات میں مصروف اپنی عاقبت کو سنوارنے کے لیے محنت کر رہے ہیں۔انسانوں کا ماننا یہ ہے کہ اگر موت زندگی پر حاوی ہے اور کسی بھی شے کو ثبات حاصل نہیں تو پھر اتنی بھاگ دوڑ اور سوچ وبچار کی کیا ضرورت ہے۔ناول ''دشتِ سوس'' میں موت وحیات کو لے کر اداسی، بے چینی، تنہائی اور فرار کی کیفیت پائی جاتی ہے جسے کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"موت زندگی کی تلاش میں رہتی ہے کہ اسے جاوداں بنا سکے۔ زندگی موت کی گھات میں ہوتی ہے کہ اسے فنا کا مزہ چکھا سکے۔ اسے معدوم کر دے اور آدمی زندگی اور موت دونوں کے لیے سرگرداں رہتا ہے کہ ان سے آزادی حاصل کر کے اسے پا سکے جو مقصود بالذات ہے جو آئینوں میں جوہر ہے اور جوہر کا جوہر ہے۔ جو ماورا ہے اور ماورا کا ماورا ہے۔ جانے آدمی موہوم تلاش میں کیوں دیوانہ ہوتا ہے۔ اپنی بے بضاعتی پر نازاں رہتا ہے۔"(13)

ماضی بعید ہو یا ماضی قریب یا پھر موجودہ زمانہ تقریباً سبھی میں صاحب اقتدار ہستیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونا، ان کے پیروں کو چومنا اور ان کے آگے بچھ بچھ جانے کا رواج اور رجحان بہت زیادہ ہے جسے قابل ستائش نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ سب چاپلوسی، بناوٹ اور دکھلاوے کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے اور ایسی اوچھی حرکات کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں نہ صرف رکاوٹ بنتی ہیں بلکہ زہر قاتل بھی ہیں۔

بعض صوفیا اور درویش صفت لوگوں کے ہاں اس طرز عمل کو احترام کے معنوں میں لیتے ہوئے اصول و ترتیب بنائی گئی اور کہا گیا کہ ایسا کرنے سے بزرگوں اور بلند مرتبہ لوگوں کی عزت کرنا مقصود ہے۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ افراد معاشرہ چاہے وہ خاص ہوں یا عوام اس فعل کو قابل نفرت سمجھنے کے بجائے اپنے لیے نجات کا ذریعہ مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول دشت سوس میں بھی ایسے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جو اس فعل سے وابستہ ہیں جیسا کہ حامد بن عباس جو بہت ظالم و جابر ہے اور لوگوں پر حکمرانی اور اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے اپناتا ہے۔

دوسری طرف جیلہ ہاشمی نے امیر المومنین جو کہ ملک کا بادشاہ ہے کے روپ میں ایسے لوگ بھی دکھائے ہیں جو متوازن اور اعتدال پسند طبیعت کے مالک ہیں اور لوگوں کا اپنی خواہشات اور ضروریات کے سلسلے میں اپنے سامنے سجدہ ریز ہونا پسند نہیں کرتے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے آسرا و بے سہارا لوگ اپنی غربت اور بے چارگی کی وجہ سے خود کو غلام ابن غلام مانتے ہیں اور اپنی عزت و شناخت کھو دیتے ہیں۔

امیر المومنین کا ماننا یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور اس آزادی کو چھین لینا صرف ایک انسان کی نہیں بلکہ تمام انسانیت کی توہین ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانوں سے ان کی مجبوریوں کے عوض ان کی آزادی صلب کر کے ان کی تذلیل کی جائے اور یوں معاشرے میں بگاڑ کی صورتحال پیدا کر دی جائے۔ اس حوالے سے ناول ''دشتِ سوس'' میں بغداد کے امیر المومنین کا یہ روپ اور سوچ ملاحظہ کیجئے:

"اسے بے جا عاجز لوگ پسند نہ تھے۔ وہ انسانوں کو مجبور و مقہور دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لیے اس کے عہد میں بغداد کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ عجیب شخصی آزادی کا قائل تھا اور لوگوں کے خیالات اگر باغیانہ نہ ہوں تو اسے پسند تھے۔ وہ منفرد سوچ اور منفرد عمل کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آدمی میں جو ایک ازلی شان ہے اور آدم کی پیشانی میں جو نور ہے جس کے لیے وہ سجدہ گاہ

قدسیاں قرار دیا گیا اسے وہ شان پسند تھی۔ جب اس کے سامنے خوشامد سے لوگ جھکتے تو وہ پیچ وتاب کھاتا کیوں کہ وہ امیر المومنین تھا اور لوگ اسے کے سامنے کی زمین کو بوسہ دے کر اس سے بات کرتے تھے۔ یہ دستور زمانہ تھا اور کیا بُرا دستور تھا۔" (14)

ناول دشت سوس میں فطرت کی منظر کشی زیادہ کار فرما نظر آتی ہے۔بنیادی طور پر فطرت ایک الگ وجود رکھتی ہے اور بے نیاز بھی ہے۔اس کا ایک گھمبیر، رعب وجلال اور اس کی دلکش فضا انسان کے مسائل، کارکردگیوں سے بے نیاز اپنا کام کرتی رہتی تھی۔انسان اپنے محسوسات ،جذبات اور اپنی کارکردگی کے لیے اسے اپنا سہارا بنالیتا ہے۔ فطرت پر انسانی مسائل، خوشیوں یا دیگر جذبات کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ فطرت کو اپنی خوشیوں میں شامل کرے یا پھر اپنے غموں سے اسے اداس کردے۔

جمیلہ ہاشمی نے ناول دشت سوس میں فطرت کے یہ دونوں رخ پیش کیے ہیں۔ ویسے بھی ایک اچھے ادیب وفنکار کی دیگر خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ فطرت کی مدد لے کر اپنی کہانی میں دلچسپی پیدا کرے اور اپنے کرداروں کے جذبات واحساسات اور آنے والے واقعات کے تسلسل کے لیے مناظر فطرت سے کام لے۔

اس حوالے سے اگر جمیلہ ہاشمی کے فن پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ بہت کامیاب نظر آتی ہیں کیوں کہ انہوں نے ناول میں اپنے تمام کرداروں کے جذبات کی عکاسی کے لیے فطرت کی رنگینی کے ساتھ ساتھ قدرت کی قہاری اور جباری کو بھی استعمال کیا ہے۔ پھر چاہے وہ مجمی اور درویشوں کے کردار وافعال کی عکاسی ہو یا سہل بن عبداللہ تستری کے مکتب کے ماحول کی فضا کی عکاسی، یا پھر صبح صادق کا منظر، بہاروں کا منظر اور حسین کے نعرہ حق کی فضا کا غم والم سبھی میں فطرت اپنی بھرپور شدت کے ساتھ درخشاں نظر آتی ہے۔

دشت سوس کی کہانی حسین بن منصور کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی نفسی کیفیات کی کہانی ہے۔ حسین ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا جو اساتذہ اور معلمین سے بے نیاز تھا۔اس کی ذات کا سفر انوکھا تھا۔ وہ اپنے اندر اور باہر کی سمتوں کو جانتا تھا۔ وہ اپنی روح کے نہاں خانوں میں اتر کر روشنی کے اس عظیم مخرج کا کھوج لگانا چاہتا تھا جو اس کے وجود کی گھٹاؤں میں مخفی تھا۔ حسین کو کسی پیر ومرشد کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ تو خود ان سے کئی قدم آگے تھا۔اس نے روایتی درس وتدریس کے مراحل جس تیزی سے طے کیے یہ اسی کی شخصیت کا خاصا تھا کسی عام انسان کے بس کی بات نہ تھی۔

اس ناول میں حسین کے ساتھ مستقبل میں رونما ہونے والے حالات وواقعات ہوں یا پھر استادوں کی حسین سے متعلق پیش گوئیاں انھیں ہم مشیت ایزدی کہیں یا پھر کچھ اور دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ یہ حسین کے اندر کا وہ طوفان تھا جو ظاہر ہوا تو ایک ہلچل اور افراتفری پھیل گئی اور اس کا انجام اس وقت کے معاشرے سے ایسا ہی متوقع تھا کہ جیسا حسین کے ساتھ کیا گیا۔

بہر کیف حسین کے نظریات جنھیں ہم تلاشِ حقیقت، عرفان ذات، روایت شکنی، جابروں کے خلاف جہاد یا کمزوروں کے ساتھ ہمدردی وغیرہ کسی بھی پہلو سے دیکھیں یہ تمام وہ باتیں ہیں جو کوئی عام انسان نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو قدرت کی طرف سے انعام خاص رکھنے والے یا اس قسم کے نظریات کے مالک ہو سکتے ہیں لیکن اگر کسی کے ذہن میں بھی حسین کو لے کر یہ سوالات بار بار جنم لیں کہ حسین نے اتنا لمبا روحانی سفر بغیر کسی

Tarjihaat
Volume:IV
Issue: III
مارچ ۲۰۲۴
March. 2024
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
Online Research Jornal
WORLD URDU RESEARCH & PUBLICATION CENTRE
WURNP

مرشد یا پیر کامل کی شاگردی اختیار کیے کیسے طے کر لیا حالانکہ صوفیا و علما تو ہمیشہ سے قدر و منزلت اور تسلم و رضا کا پیکر سمجھے جاتے تھے تو اس کا مختصر جواب میری رائے کے مطابق یہی ہو سکتا ہے کہ حسین جو کہ خودی جلوہ خداوندی کا جائزہ لے سکتا تھا۔ دراصل خدا اور بندے کے درمیان عبادت کو سب سے بڑا وسیلہ سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے لیے مناسب راہوں کا انتخاب بھی کر سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اسے ظاہری طور پر کسی مرشد کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس ناول کا ایک اہم کردار اغول بھی ہے جو کہ ایک فرضی کردار ہے اور حسین کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے۔ اغول حامد بن عباس کی منظور نظر اور اس کے بیٹے کی ماں ہے لیکن آخری دم تک گرفتار عشق حسین رہی۔ کسی بھی معاشرے میں شدت پرستی اور انتہا پسندی جیسے رجحانات تباہی کا باعث ہیں اور ان رجحانات سے پُر کردار حامد بن عباس کا ہے جو کہ انتہائی مکار اور حیوان ہے۔ یہ کردار خون ریزی کا رسیا ہے اور اغول کی وجہ سے حسین کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے کیوں کہ وہ حسین کو اپنی محبت کا قاتل اور اپنی ترقی کی راہ کا مضبوط کانٹا تسلیم کرتا ہے۔

اس ناول میں حامد بن عباس ظلم و جبر کا ایک استعارہ ہے اور اس کی سوچ مرنے مارنے اور مٹنے مٹانے کی حد تک ہی محدود ہے۔ وہ حسین بن منصور کو کسی صورت معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے۔ حسین کے حوالے سے ناول ''دشتِ سوس'' میں بیان کردہ اس کی سوچ یہ ہے کہ :

> "خالی نشست گاہ میں وہ دیوانوں کی طرح پھرتا رہا۔ کیوں، آخر کیوں؟ حسین رہے اور اغول نہ رہے۔ وہ شعبدہ باز حیلہ جو رہے اور وہ سچائی بھی، مٹ جائے، وہ ہر اس نقش کو مٹا دے گا جو اغول کے اور اس کے درمیان تھا۔ اس کے، حامد بن عباس کے نصیب میں محبت نہیں نفرت تو تھی۔ شدید عمیق نفرت۔ سب چارہ گر ناکام ہو چکے تھے۔ زہر آلود نیزے کی انی دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ آخری کوشش کرلے گا۔ اگر محبت اس کا حق نہیں تو نہ سہی۔ نفرت کرنا، مٹانا، معدوم کرنا تو اس کے اختیار میں تھا۔ ہاں وہ ہمیشہ ان لق و دق صحراؤں میں آوارہ ہواؤں کی طرح سرگرداں نہیں رہے گا وہ قرار پائے گا۔" (15)

حامد بن عباس بھی اس ناول کا سب سے اہم کردار ہے جو وزیر مملکت ہوتے ہوئے بھی بذات خود کئی مسائل کا شکار ہے۔ اپنی زندگی کے بہت سے مقامات پر ناکامیوں کا سامنا کرنے کی وجہ سے وہ معاشرے کا ایک مایوس انسان نظر آتا ہے اور اپنی اس نامرادی، مایوسی اور ناکامیوں کا بدلہ وہ حسین سے لیتا ہے کیوں کہ زندگی کے سب سے بڑے معاملے میں اس کی سوچ کے مطابق حسین نے اسے شکست سے دوچار کیا۔

حامد بن عباس اپنی تشنہ خواہشات اور معاملات کا ذمہ دار حسین کو ٹھہراتے ہوئے اسے اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ وہ اسے ایک عبرت ناک انتقام و انجام سے دوچار کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ سوچ بچار شروع کر دیتا ہے۔ حامد بن عباس کی صورت میں جمیلہ ہاشمی نے

معاشرے کے ایسے افراد کو برہنہ کیا ہے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے بعد عوام کو ذاتی جاگیر سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ ہر طرح کا رویہ روا رکھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایسے افراد کے لیے کوئی قانون نہیں بنا ہوتا کہ جس کے شکنجے میں وہ آسکیں کیوں کہ قانون کے رکھوالے بھی انہی بڑے لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں اور انہی کے حکم پر اپنے منصب کا اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ بالکل حامد بن عباس کی طرح جو خلیفہ وقت کا وزیر خزانہ ہوتا ہے اور اختیارات اور وزارت کی چکاچوند نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود کو مطلق العنان سمجھتا تھا اور رعایا اور اپنے ماتحت لوگوں سے ظلمانہ سلوک کرتا تھا۔

ناول دشت سوس کے ذریعے جمیلہ ہاشمی نے ہمیں اس حقیقت سے بھی روشناس کروایا ہے کہ جن معاشروں کے حکمران اپنے ملک اور عوام کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے خوف سے عاجزی اپناتے ہیں تو ان معاشروں میں معاشرتی مسائل مثلاً چوری، قتل وغارت، زنا و بدکاری، جھوٹ، اقرباپروری، دل آزاری، فرائض سے چشم پوشی وغیرہ جیسے جرائم بہت حد تک کم یا نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

ایسے معاشروں میں چار سو خوشحالی، امن، رنگینیاں، انسان دوستی، مذہبی، انسانی، اخلاقی، معاشرتی، قومی، روایتی، اجتماعی اور انفرادی خوشیوں کا دور دورہ ہوتا ہے اور بلاشبہ اسی طرح کے معاشرے اور عوام ترقی کی راہ پر گامزن بھی ہوتے ہیں اور ہر کوئی انہیں پسند کرتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی معاشرے سے حسد و بغض، نفرت و کدورت، عناد و دشمنی، کینہ اور شخصی غلامی جیسی برائیوں کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ یہ تمام وہ برائیاں ہیں جو بغداد کے اس وزیر یعنی حامد بن عباس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں اور اس کے ان منفی جذبات کی بھینٹ حسین بن منصور حلاج چڑھتا ہے حالانکہ حسین کا کوئی جرم نہیں لیکن پھر بھی وہ حامد بن عباس کی نظر میں ایک فتنہ ہے۔ حامد بن عباس کے اندر حسین سے انتقام لینے کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے جمیلہ ہاشمی نے ناول ''دشتِ سوس'' میں اس طرح بیان کیا:

> "کل کا دن اسے دار پر دیکھے گا اور آپ بطور گواہ وہاں موجود ہوں گے کہ ہر کام اسی طرح انجام پایا جس طرح میں نے چاہا ہے۔ ہاں میں چاہتا ہوں اس کی ہڈیوں میں اتنے چھید ہوں جیسے نے میں ہوتے ہیں۔ اس کا گوشت ریشہ ریشہ کاٹا جائے اور اس کو اتنی بے پناہ اذیت ہو کہ دشت سماویہ تک اس کی آواز پہنچے۔ قبروں میں سونے والے جاگ اٹھیں اور ماتم کریں اور ان کی سینہ کوبی کی آوازیں مشرق سے مغرب تک ہر جگہ سنائی دیں۔ کبھی بھلائی نہ جا سکیں۔ دنیا اس کی کرب ناک چیخوں سے گونجتی رہے، گونجتی رہے۔ کوئی زمانہ کوئی وقت کبھی اس اذیت کو بھلا نہ سکے۔ قطرہ قطرہ اس کا خون جس جگہ گرے وہاں ہمیشہ کے لیے ٹھہرا رہے۔ ساعت بہ ساعت اس کا سانس اکھڑے اور ہوئیں اسے اقصائے عالم میں لے جائیں وہ ایک ہمیشگی کی چیخ بن کر زندہ رہے۔" (16)

درج بالا اقتباس کو پڑھتے ہوئے نہ صرف رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جذبات واحساسات منجمد ہو جاتے ہیں بلکہ زبان بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتی یا یوں کہیے کہ الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں حامد بن عباس کے وحشی کردار اور جذبات کو پڑھ کر۔ حسین بن منصور جو ایک صوفی منش اور سچا مسلمان تھا جو خود کو فنا فی اللہ کے درجے پر قائم رکھنا چاہتا تھا اور عشق خداوندی میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ خود کو "انا لحق" کہتا تھا اور جس نے حامد بن عباس جیسے زمینی خداؤں اور وقتی حکمرانوں کے سامنے علم بغاوت بلند کرتے ہوئے عارضی آقاؤں کے وجود کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ان مخالفین نے اس پر کفر، فریب کاری اور شعبدہ بازی کے الزامات لگائے اور یوں حامد بن عباس جیسے وزیروں نے اس وقت کے مخالفین اور مصنفین کو بھی اپنے ساتھ ملا کر 914ء میں ذاتی رنجشوں اور بعض وعناد کے سبب قید خانے میں ڈال دیا اور پھر اس فقیری صفت رکھنے والے عاشق رسول ﷺ اور عشق خداوندی میں ڈوبے ہوئے انسان کو سنگسار کروایا۔ بس اتنا ہی نہ ہوا بلکہ اس پاک ہستی کے جسم کے ریشے، ٹکڑے اور نجانے کیا کچھ کیا۔ بے شک دشمنوں کے ہاتھوں حسین بن منصور حلاج ایک سفاکانہ موت سے دوچار ہوا لیکن اس کے جسم کا انگ انگ وصال خداوندی کے شوق میں انا الحق کا ورد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اہل بغداد بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اہل دنیا حسین بن منصور کے خاتمے پر حیرت کناں اور سینہ کوبی کرتی نظر آئی لیکن خود حسین جل کر ایک بڑے شعلے میں جذب ہو جانے کو باعث رحمت سمجھتا ہے۔ ناول میں حسن بن منصور کی موت کی کربناکی کا اندازہ ناول ''دشتِ سوس'' سے لیے گئے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> "خلقت کا اژدھام تھا اور جلاد کوڑا لیے کھڑا تھا۔ حسین کی پیٹھ جو محض استخوان تھی ننگی کی گئی۔ آہ وبکا کی صدائیں برابر آرہی تھیں۔ اس کی پوتیاں تھیں، اس کے بیٹے، ان کے دوست اور جانے کون کون رورہا تھا۔ دیوانے کو کلمہ کفر کہنے کی سزا دی جارہی تھی۔ کوڑے کے لہرانے کی آواز جیسے سانپ کی پھنکار ہو اور حبشی کی ہانپتی ہوئی سانسیں جیسے ساز بجایا جارہا ہو۔ پتہ نہیں دیوانہ چیخ کیوں نہیں رہا تھا۔ حسین کی بیٹیاں بے ہوش ہو گئیں، نالہ وبکا کی آوازیں آندھی کے ساتھ مل کر سارے بغداد پر، اس کے محلوں پر، اس کے گلیاروں اور بازاروں میں، شاہراہوں پر گھومیں۔ کنیزیں اور لونڈیاں رو رہی تھیں جیسے کوڑوں کی نغمگی انہیں رلا رہی ہو۔ حسین بن منصور دیوانہ تھا تو سہی مگر کیسا دیوانہ تھا کہ کوڑوں کے باوجود ہنستا تھا اور جب خروش میں اس کی جان آدام پاتی تو انا الحق کہتا تھا۔ کوڑوں کی شدید ضرب بھی اسے آہ کھینچنے پر مجبور نہ کر سکی تھی وہ زندہ تھا اور انا الحق کہہ رہا تھا پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ کوڑے کی ہر ضرب انا الحق کہہ رہی تھی۔ خود حبشی آہ کرنے کی جگہ انا الحق کہہ رہا تھا۔ عجیب بات تھی۔ کچھ لوگ یونہی سنگباری کرنے لگے، سنگباری بھی ایک ساز کی آواز کی طرح اپنی لے بدلنے لگ

Tarjihaat
Volume:IV
Issue: III
مارچ ۲۰۲۴
March. 2024
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
Online Research Jornal

گئی ہر پتھر جو دیوانے سے چھو جاتا انا الحق کہنے لگتا، حبشی نے اس کے پاؤں کاٹے، چھری کند تھی اور ریشہ ریشہ کٹ رہا تھا نہایت آہستگی سے۔ حسین کا چہرہ زرد تھا۔ حامد کا پیغام آیا اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو اسکے بازوں کاٹ ڈالو۔ حبشی نے کہا میں اب جوڑ جوڑ بند بند کاٹوں گا۔ کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون بہتا دیکھ کر اس نے اپنے منہ پر مل لیا۔ آقائے رازی نے کہا یہ کیا کر رہے ہو؟ وضو کر رہا ہوں تا کہ نماز عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی کیا عشق مزرع زندگی نہیں۔ حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمہیں جان سے گزرنے کا بھی خیال نہیں۔ رازی نے کہا۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھی جو راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔"(17)

جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں قاری کی دلچسپی کو اس قدر برقرار رکھا کہ قاری نے شروع تا آخر اسے پڑھتے ہوئے کہیں بھی تھکن محسوس نہ کی۔ میرے خیال میں مصنفہ نے اس ناول کو ایک غنائیہ قرار دے کر بالکل سچ لکھا ہے کہ اس کے مندرجات کسی اور زمرے میں شاید ہی آتے ہوں۔ حسین بن منصور جیسی شخصیت پر لکھنا واقع ہی ایک دشوار گزار اور کٹھن کام ہے مگر مصنفہ نے کمال مہارت اور چابکدستی کے ساتھ ناول دشت سوس میں حسین کے بچپن سے لے کر تختہ دار پر سزا پانے تک کے دنیاوی و باطنی سفر کو قلمبند کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ناول دشت سوس کا حصہ مکالمات اور واقعات کا اجتماع نہیں بلکہ اس کے مختلف کرداروں کی خود کلامی ہے جن کے ذریعے وجود، تصوف، روحانیت، عشق اور معاشرتی مسائل جیسے مشکل اور گنجلک موضوعات پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ حسین بن منصور کی دیوانگی و مجذوبیت اور اس کے پس پردہ اس عہد کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات واقعات کو اس ناول میں جس طرح سے بیان کیا گیا ہے یہ انداز و بیان اردو نثر میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ بہر حال ہر معاشرے میں کھرے کھوٹے اور اصل و نقل کردار موجود ہوتے ہیں اور ایک اچھے اور حساس ادیب کو چاہیے کہ وہ ان کرداروں اور ان کی بناوٹوں کو قارئین یا افراد معاشرہ کے سامنے لے کر آئیں۔

حواشی

1. جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، اشاعت، چہارم، 2016) ص۔ ۸
2. جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، ص۔ ۱۱
3. ایضاً، ص۔ ۱۹
4. ایضاً، ص۔ ۵۵
5. ایضاً، ص۔ ۳۳
6. ایضاً، ص۔ ۶۱
7. ایضاً، ص۔ ۱۴۵
8. ایضاً، ص۔ ۱۵۴
9. ایضاً، ص۔ ۱۸۶

10. ایضاً، ص۔ ۱۹۲
11. ایضاً، ص۔ ۲۰۳
12. ایضاً، ص۔ ۴۵۵
13. ایضاً، ص۔ ۴۸۰
14. ایضاً، ص۔ ۴۲۲
15. ایضاً، ص۔ ۴۸۷
16. ایضاً، ص۔ ۴۹۱

ماخذ:

- جمیلہ ہاشمی،دشتِ سوس،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،اشاعت، چہارم،2016)

Reference in Roman Script:

Jamila hashmi, dast-e sous, (Lahore : sang e meel publication,, ishaat, chaharum, 2016) p. 8
Jamila hashmi, dast-e sous, p. 10, 11
ayzan, p. 19
ayzan, p. 55
ayzan, p. 33
ayzan, p. 61
ayzan, p. 145
ayzan, p. 154
ayzan, p. 186
ayzan, p. 192
ayzan, p. 202, 203
ayzan, p. 328, 329
ayzan, p. 455
ayzan, p. 480, 481
ayzan, p. 422
ayzan, p. 487
ayzan, p. 491, 498

Mohsin Khalid Mohsin